۱-۲

اکتوبر ۲۰۲۱ء — جنوری ۲۰۲۲ء

مدیر:
کاشف علی خان شیروانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

شمارہ نمبر ۱-۲ — اکتوبر ۲۰۲۱ء، جنوری ۲۰۲۲ء

کاشف علی خان شیروانی، مدیر ”حرف نیم گفتہ“، نے الائیڈ پرنٹرز، ۲۶ مال روڈ، لاہور، سے چھپوا کر ۸۰-سی، مسلم نگر، رائیونڈ روڈ، لاہور، سے شائع کیا۔

فکر غامدی سے اعلان رجوع

کاشف علی خان شیروانی

میرا تعلق ایک روایتی سنی حنفی گھرانے سے ہے۔ اوائل عمر میں دین سے وابستگی تو تھی مگر دینی علم سے کوئی مس نہیں تھا۔ دینی علوم سے میری دلچسپی سنہ ۱۹۹۷ء میں شروع ہوئی جب میں یونیورسٹی آف انجینئیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، لاہور میں طالب علم تھا۔کچھ عرصہ تبلیغی جماعت اور اہلحدیث مکتبِ فکر سے منسلک رہا۔ سنہ ۱۹۹۸ء میں امین احسن اصلاحی صاحب اورجاوید احمد غامدی صاحب کے لٹریچر سے متعارف ہوا اور جلد ہی اُن سے عملاً وابستہ ہوگیا۔ المورد میں عربی زبان اور دینی علوم کی تعلیم حاصل کی۔ یہ دینی تعلیم غامدی صاحب کے مکتبِ فکر کے تناظر میں دی جاتی تھی۔ کلاسیکی علوم، یعنی تفسیر، فقہ، اور حدیث کی رسمی تعلیم پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی، اور اگرتھی بھی تو اُس کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاتا تھا وہ متجدّدانہ تھا۔ زیادہ زور عربی زبان، شعر جاہلی، اور مکتب غامدی و فراہی کے مطابق قرآن و حدیث سمجھنے پر تھا۔ میں نے دورانِ تعلیم روایتی نقطۂ نظر رکھنے والے علماء اور ان کی تحریروں سے بھی ناطہ نہ توڑا۔ چنانچہ غامدی صاحب کی فکر پرمکمل شرح صدر کبھی حاصل نہ ہوا۔تعلیم مکمل ہونے کے بعد غامدی صاحب کی فکر سے تفصیلی واقفیت تو ضرور حاصل ہوئی مگر دل و دماغ کوشکوک وشبہات سے چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ ایک تذبذب اور تامل کی کیفیت تھی۔ اس بے چینی کو ابھی زبان ملنا تھی۔

سنہ ۲۰۰۲ء تا سنہ ۲۰۰۳ء کے دوران، یہ بے چینی ٹھوس سوالات کی صورت میں ڈھل چکی تھی۔ یہ غامدی فکر سے میرے اختلافات کا آغاز ہے۔ اس مرحلے پر میں نے مقامِ حدیث، فطرت، اور پردے کے مسائل پر غامدی صاحب کے موقف پر سوالات کھڑے کرنے شروع کئے۔ جب میں یہ سوال کر رہا تھا تو اکیلا نہیں تھا۔مثلاً، المورد کے کئی رفقاء کے ذہنوں میں یہ سوال موجود تھا کہ اگر حدیث سے نیا دین ثابت نہیں ہوتا تو پھر غامدی صاحب کے نزدیک، غلام احمد پرویز کی طرح، کیا حدیث شریف

کی اہمیت محض تاریخی ہے؟ اسی طرح پردے کے معاملے پر غامدی صاحب کی تعبیر مضحکہ خیز حد تک سطحی محسوس ہوتی تھی۔ پردے کا لفظ ہی متروک کر دیا گیا اور اس کی جگہ "حفظِ فروج" کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ حفظِ فروج سے غامدی صاحب کی مراد یہ ہے کہ مرد و عورت اپنی شرمگاہیں (erogenous zones) کہیں نہ کھولیں اور نہ ان "اعضا کو نمایاں" کریں، الا یہ کہ کسی کے سامنے شریعت نے اُنہیں کھولنے کی اجازت دی ہو۔ اس کے نتیجے میں سینے، گریبان، اور شرمگاہوں کے علاوہ باقی اعضاء کو ڈھانپنے کا حکم غامدی صاحب کے "قانون" میں بہرحال نہیں ہے، یعنی "قانون" کی رُو سے دیگر جسم کو برہنہ رکھنا مباح ہے۔ چنانچہ "میزان" میں فقط یہی اختصاری شریعت بیان کی گئی ہے۔ چونکہ یہ تعبیر کسی مسلمان مرد یا عورت کے لیے قابلِ قبول نہیں، لہٰذا دیگر جسم کو برہنہ کرنے سے روکنے کے لیے غامدی صاحب محض کھوکھلا وعظ کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب وہ "قانون" کو واضح کر چکے ہیں تو پھر ان کے اخلاقی مواعظ کوئی کیوں سنے؟ یہ سوال ذہن میں کلبلاتا رہا کہ آیا غامدی صاحب دین کو "آلائشوں" سے پاک کر رہے ہیں، یا مسلمانوں میں مغربی انسان کے اقدار، ذوق، اور شرم و حیا کے پیمانوں کو فروغ دینا چاہتے ہیں! غامدی صاحب کا یہی minimalism ہے جس کی وجہ سے ان کے متاثرین کے ہاں روایت سے انحراف ایک قابل تعریف شے بن چکا ہے۔ پھر اُس دور میں یہ بات بھی کبھی نہ سمجھ سکا کہ غامدی صاحب کے نزدیک فطرت کا اصول اتنی اہمیت کیوں اختیار کر گیا ہے؟ اس مذہبی تعبیر کے مطابق فطری "حقائق" دین پر بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ غامدی صاحب کے نزدیک فطری حقائق کا علم ہر انسان کے شعور میں جاگزیں ہے مگر غامدی صاحب کے ان فطری حقائق کی معروضی حیثیت یہ ہے کہ خور و نوش کے معاملات میں دنیا کی کثیر آبادی کی فطرت ہی مسخ ٹھہرتی ہے (کیونکہ کثیر آبادی غامدی صاحب کے "فطری" اصولوں پر عمل نہیں کرتی)۔ کیا یہ صورت حال کی صحیح تعبیر ہے؟ یہ سوال کرنے پر تقریباً یہی جواب مجھے ملا تھا، یعنی لوگوں کی فطرت مسخ ہو گئی ہے۔ یہاں ان سوالات پر کوئی علمی مباحثہ مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ یہ اور ان جیسے دیگر سوالات کبھی حل نہ ہو سکے۔ تاہم سنہ ۲۰۰۶ء تک میرے یہ سوالات کسی مربوط و مرتب شکل میں نہیں تھے۔ بس غامدی صاحب کی فکر پر اِدھر اُدھر چند سوالات تھے لیکن ان کی شیرازہ بندی کسی فکری نظام میں نہیں ہوئی تھی۔

کچھ عرصے بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہ فکری تناظر بھی میسر آ گیا۔ سنہ ۲۰۰۷ء–سنہ ۲۰۰۸ء میں، اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ اپنے ایم فل تھیسز میں مولانا مودودیؒ اور پھر پی ایچ ڈی میں مولاناؒ کے علاوہ ڈاکٹر فضل الرحمان کے تفصیلی مطالعے کا موقع ملا۔ ذاتی مطالعے اور پی ایچ ڈی کے طالب علموں اور اساتذہ سے تبادلہ خیال ہوا تو میرا ذہن کھلتا چلا گیا۔ ایک تو ڈاکٹر فضل الرحمان کے تفصیلی مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ اخذ دین کے "منہج" (یا "میتھاڈولوجی") میں اختلاف کے باوجود غامدی

صاحب اور ڈاکٹر فضل الرحمان کی فکر میں بنیادی فرق نہیں۔ دونوں حضرات ایک جیسے مفروضوں کے ساتھ دین پر غور کرتے ہیں، ایک جیسے سوالات انہیں درپیش ہیں، اور حیرت انگیز طور پر اکثر معاملات میں ایک جیسے نتائج پر پہنچتے ہیں۔ ان دونوں کے افکار کے استعمار اور استشراق سے گہرے فکری بندھن ہیں۔عقل وفطرت کی مرکزی حیثیت، شرعی احکام کی متجددانہ تاویلات، اور انکارِ حدیث – سب خیالات کا منبع اصلاً استعمار اور استشراق کے زیر اثر مسلمانوں میں پروان چڑھی تجدّد کی وہ بدنام تحریک ہے، جسے اہلِ علم ضلالت اور گمراہی کے مترادف سمجھتے ہیں۔مغرب کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق قدیم ہے، لیکن اُن کے ساتھ آقا اور غلام کا تعلق بس دو ڈھائی صدی پرانا ہے، جب یوروپی استعمار نے قدم جمانے شروع کیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تجدد کی تاریخ بھی استعماری غلبے سے شروع ہوتی ہے۔ جب مسلمان فوجی و معاشی شکست کھانے کے بعد علم و تہذیب کے میدان میں بھی ہتھیار ڈال چکے تھے تب تجدّد کا دام بچھایا گیا۔ چنانچہ اکثر متجددین کے ہاں دین کی ہر اس تعلیم سے براءت کا رجحان پایا جاتا ہے، جو کسی لحاظ سے مغرب سے متصادم ہے، چاہے اس کا تعلق ضروریات دین سے ہو، دین کے مقدس متون سے ہو، یا فقہ، کلام، اور تصوف سے! یہ طائفۂ متجددین ہر اس چیز کا انکار کریں گے یا تاویل، جو بہرحال مغرب کو خوش آتی ہو۔ اب چونکہ یہ خواتین و حضرات بہرحال مسلمان رہنا چاہتے ہیں لہٰذا اسلام اور مغرب کا ملغوبہ، ایک جانب مغرب کے ناکافی علم وفہم سے، اور دوسری جانب اسلام اور اس کی روایت کے مواد کے سوئے استعمال ہی سے تیار کرتے ہیں۔ اس معاملے میں چاہے یہ اپنے "علمی اصولوں" کا جتنا بھی ڈھول پیٹیں ان کا اصل الاصول صرف مغرب سے مفاہمت ہے۔

ستم بالائے ستم، غامدی صاحب کے ہاں ایک خرابی ہے جو تجدّد کے دورِ اول و ثانی[۱] میں نہیں پائی جاتی تھی، یا اگر پائی جاتی تھی تو دبی دبی سی تھی۔ اُن متجددین میں سے اکثر کے ہاں دین کی جدید تعبیر کی جستجو دراصل امتِ مسلمہ کی حمایت کے جذبے سے پھوٹتی تھی، یعنی عہدِ استعمار میں حالات مشکل ہیں مگر ان میں اپنا تحفظ اور بقا بہرحال ضروری ہے، جس کے لیے جدید تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے، برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اُن سے وفاداری ہی دین کا تقاضا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اُن کے نزدیک مسلمانوں کی فلاح، ملازمتوں کا حصول، معاشی ترقی وغیرہ کے مقاصد اگر دین کے Anglicized Version کو فروغ دینے سے حاصل کئے جا سکتے ہیں، تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اُن متجددین کا طریقہ کار اور تعبیرات گمراہ کُن سہی، مگر ان میں مسلمانوں سے گہری ہمدردی، اُنس، اور حمایت کے جذبات موجود تھے۔ غامدی صاحب کے ساتھ حادثہ یہ ہوا ہے کہ موصوف دینی حمیت سے تو

۱۔ میرے نزدیک تجدد کا دور اول سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک اصلاح پر مشتمل ہے، اور دوسرا دور بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر تقسیم ہند تک محیط ہے۔

بے بہرہ تھے ہی، اس پر غضب یہ ہُوا کہ اُن کے ہاں عامۃ المسلمین کے خلاف ایک شدید نفرت بھی جڑ پکڑ گئی۔ یہ وہی نفرت ہے جو مغربی استعماری اقوام کو اپنی زیردست اقوام سے ہوتی ہے۔متجددین استعماری قوتوں سے وفاداری کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی مُستعمِر جیسا سمجھتے ہیں۔متجدد اپنی قوم کو مُستعمِر کی نظر سے دیکھتا ہے، لہٰذا اُسے اپنی قوم ہر اعتبار سے پست اور وحشی نظر آتی ہے۔ افغانستان، مصر، عراق، لیبیا، پاکستان، غرض کہ جہاں جہاں استعماری طاقتوں کی طرف سےمسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے، غامدی صاحب کے نزدیک اس ظلم کی وجہ بھی خود مسلمان ہی ہیں۔مسلمانوں کے علماء اور ان کے روایتی اداروں سے انہیں فقط دہشت گردی اور انتہا پسندی ہی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ غامدی صاحب کے ہاں یہ جذبہ اس دور میں بھی واضح تھا جب میں ان کے حلقے سے منسلک تھا۔ اس معاملے میں ان سے شدید اختلاف رہا مگر اب تو مسلمانوں کی مخالفت اور روایتی دینی و ملی مساعی سے ایک نوع کا کینہ موصوف کے ہاں نفسیاتی بیماری کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ذرا مسلمانوں کے حقوق کی کوئی بات شروع ہو تو غامدی صاحب کی ایک ویڈیو منظر عام پر آتی ہے جس میں وہ ”خالص قرآن و سنت کے مطابق“ مسلمانوں کی گوشمالی کرتے نظر آتے ہیں۔ جب سے موصوف مغرب میں آباد ہوئے ہیں، ان کی حیثیت ایک comprador دانشور کی سی ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس انجام سے تمام مسلمانوں کو محفوظ و مامون رکھے، آمین۔

میں غامدی صاحب کی فکر کے ان پہلوؤں پر نکتہ چیں تو بہت عرصے سے تھا مگر سنہ ۲۰۰۹ء میں لکھ کر اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ احساس ہے کہ جو لوگ میری ”تبلیغ“ کے باعث غامدی صاحب کے تجدّد کا شکار ہوئے تھے مجھے اس کا ازالہ کرنا ہو گا ورنہ خدا کی بارگاہ میں کیا منہ دکھا پاؤں گا۔

میں آج واضح طور پر اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میرا اب جاوید غامدی صاحب کی فکر سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ میں اس فکر کو امت کے لئے سخت گمراہ کن اور ضرر رساں سمجھتا ہوں، جس کی بنیاد انکارِ حدیث اور ضروریاتِ دین کے انکار پر رکھی گئی ہے۔ جدید عقائد تراش تراش کر دین میں داخل کیے جارہے ہیں اور دین کو موم کی ناک بنایا جا رہا ہے تا کہ وہ جدیدیت کے عین مطابق ہو جائے۔ واضح رہے کہ جدیدیت (condition of modernity) اپنی سرشت میں وہ جاہلیتِ جدیدہ ہے جس کا زیغ و ضلال عربوں کی جاہلیتِ قدیمہ کو شرماتا ہے۔ میں اس سب کا انکار کرتا ہوں۔ میں ابتدا ہی سے سُنّی حنفی تھا، اور غامدی صاحب کی فکر سے رجوع کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اپنے اولین عقیدے اور مذہب کی طرف لوٹ گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے درخواست ہے کہ وہ میرے اس گناہ پر مجھے معاف فرمائے جس کا ارتکاب میں نے اس فکر کی ترویج کر کے کیا تھا۔

***

Quarterly Harf-e-Neem Gufta Lahore
Email: harfeneemgufta@gmail.com
Mailing Address: 80-C Muslim Nagar Housing Society, Raiwind Road, Lahore.
Postal Code: 53700